میر تقی میرؔ کے غم کی آفاقیت

The Universality of Meer Taqi Meer's Agony

ڈاکٹر روبینہ شاہین* / ڈاکٹر انتل ضیاء**

Abstract:

Mir Taqi Mir's poetry would not be out of place if it was called a depiction of the age. The environment and society affect every human being, it is inevitable. The environment is more sensitive to the sensitive nature, so to understand any poet and writer, it is absolutely necessary to study his modern environment. In the background of the pain and sorrow that is found in Mir's poetry is his own past. Uncertainty, useless possessions, apathy of loved ones and failure in love, were the factors that had a profound effect on his psyche.

میر تقی میرؔ کی شاعری کو اگر عہد کی منظر کشی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ماحول اور معاشرے کا اثر ہر انسان پر ہوتا ہے، یہ ایک ناگزیر امر ہے۔ اس بنیادی نقطے کو اگر شاعر اور ادیب پر لاگو کیا جائے تو وہ اس سے بلکل مبرا نہیں ہے۔ ماحول حساس طبع پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے لہٰذہ کسی بھی شاعر اور ادیب کو سمجھنے کے لئے اس کے عصری ماحول کا مطالعہ ازبس ضروری عمل ہے۔ میر تقی میرؔ کی شاعری میں جو سوز و گداز اور غم و الم کی تصویر ملتی ہے، اس کے پسِ منظر میں میر کی اپنی آپ بیتی اور جگ بیتی ہے۔ میر تقی میرؔ کی ذاتی زندگی میں جو رنج و الم اور ابتدائی دور کے جو مصائب تھے اس نے ان کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔ بے یقینی بے سروسامانی اور اپنوں کی بے مروتی اور اس پر عشق میں ناکامی یہ وہ عوامل تھے جس نے میر تقی میرؔ کو غم کی ابدی حقیقت سمجھائی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبد

* پروفیسر، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور

** شعبہ اُردو، جامعہ شہید بینظیر بھٹو برائے خواتین، پشاور

اللہ لکھتے ہیں:

"میرؔ اپنے زمانے کے واقعات سے یقیناً متاثر ہوئے وہ سلطنت دہلی کی بربادی اور عام انسانی غم و الم سے ضرور غم زدہ ہوئے مگر اس سے کہیں زیادہ انھیں اپنے دل کی بستی کے اجڑنے کا غم تھا۔"(۱)

شاعر و ادیب چونکہ زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے ان کا مشاہدہ اور تجزیہ بھی گہرائی پر مبنی ہوتا ہے۔ میر تقی میرؔ بحیثیت شاعر ایک تخلیق کار تھے، اس لئے وہ نہ صرف زیادہ سنتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں بلکہ محسوساتی سطح پر بھی عام لوگوں سے خاص تھے۔ حسن واصف اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"خود اُردو شاعری بڑی ہو یا نہ ہو میرؔ کی شاعری بہت بڑی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد بڑی مضبوط ہے۔ یہ ایک فرد کی جسمانی اور ذہنی نامرادی کی کہانی ہے اور اس میں یونانی ٹریجڈی کا لطف ہے۔"(۲)

میر تقی میرؔ کی ذات میں دردمندی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ زندگی کی بے ثباتی اور آرزوؤں کی عدم تکمیل انسان کو یاس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ غم زندگی کی مکمل کیفیت ہے اور مسرت یا خوشی عارضی چیز ہے۔ میرؔ کے ہاں بھی شاعری کی مختلف صورتوں میں عدم تکمیل، نایافت، نارسائی اور زندگی کی بے ثباتی پائی جاتی ہے۔ عدم تکمیل کا احساس میرؔ کی تشبیہات، استعارات اور متخیلہ میں موجود ہے۔ غم کی دائمی و ابدی حیثیت کو میرؔ نے نہ صرف تسلیم کیا ہے، بلکہ اس ایک غم کے ایسے ایسے رنگ شعری پیکر میں پروئے ہیں کہ ہر صاحب احساس اس آئینہ میں خود کو دیکھ پاتا ہے۔ اسی بنا پر ٹی-ایس ایلیٹ نے شاعر کو محض ذاتی احساس سے بلند ہو کر اجتماعیت کی تصویر پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ اس کا خیال ہے کہ ذاتی احساس و تجربہ خود شاعر کے لئے بحیثیت آدمی اہم ہوتا ہے، لیکن بحیثیت شاعر اس کے لئے اہم نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تخلیقی قوت شاعر اور آدمی کے نقطہء نظر سے ضروری اور غیر ضروری میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ بڑی شاعری میں کوئی جذبہ یا احساس ذاتی نوعیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسرے جذبوں کا حصہ بن کر اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور انھیں کے امتزاج سے اپنا الگ وجود بھی بنالیتا ہے۔

میر تقی میرؔ نے ذاتی غم کو اجتماعی غم میں اس انداز سے مدغم کر دیا ہے کہ وہ اس عہد کے ہر آدمی کا غم معلوم ہوتا ہے۔ میرؔ کی شاعری میں آفاقیت کا عنصر کچھ یوں سامنے آتا ہے کہ جب ہم آج ان کے مشاہدات اور تجربات کے پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں اپنا عکس معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان کا یہ شعر ہے:

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا(۳)

شاعر اپنے حواس کے ذریعے اشیاء اور احساسات کے تجرباتی مرحلے سے گزرتا ہے۔ وہ اس کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ پھر شاعر اس جمع شدہ معلومات کو نئے اور انوکھے رنگ ڈھنگ میں پیش کرتا ہے۔ میر تقی میرؔ کا تخیل اعلیٰ تجربات اور مشاہدات عمیق، احساس متحرک اور بیان سادگی و پرکاری کی مثال ہے۔ ان کے شعری پیکر مختلف انسانی جبلتوں کی غماز ہے، اس لئے ان کی اثر پذیری دائمی ہے۔ میرؔ نے کائناتی جہتوں کا احاطہ انتہائی سادگی سے کیا۔ انھوں نے دلی اور دہلی کی بربادیوں کا تذکرہ بہت پر اثر الفاظ اور انداز میں کیا۔ ان کے شعری پیکر خارجی ماحول سے اپنا خول تلاشتے ہیں، باقی ہر شے داخل سے مل جاتی ہے۔ بجھتے جراغ، ٹوٹے دل، خون میں لتھڑے اجسام، اجڑی بستیاں، کلی کا کھلنا، زندگی کی بے ثباتی اور زرد چہرہ عشق کی ناکامی کی علامت بن کر میرؔ کے داخل سے نمودار ہوتے ہوئے صفحہء قرطاس پر اشعار کی صورت جلوہ گر ہوتے ہیں۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا(۴)

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا(۵)

جیتے جی کوچہء دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا(۶)

میر تقی میرؔ کو غم بے زار نہیں کرتا بلکہ ان کے آئینہ دل کو چمک عطا کرتا ہے۔ میرؔ کی شاعری کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ آنے والے شعراء کے لئے مشعلِ راہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ ایک روایت کے امین تھے اور انھوں نے خود کو آنے والوں کے لئے ایک روایت کی صورت میں چھوڑا۔ پروفیسر آل احمد سرور اس حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"میرؔ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے کچھ کلیدی الفاظ ہیں جو بعد کی روایت بن گئے۔"(۷)

میرؔ کی شاعری اپنے عہد کا منظر نامہ ہے اور ان کے الفاظ منظر کی عکاسی کے لئے آئینے کا کام کرتے ہیں۔ زبان کے تخلیقی استعمال میں مظاہر فطرت اور مظاہر انسانی کے ملاپ سے تخلیق کار جذبات اور احساسات کا بیان کرتا ہے۔ زندگی کی نیرنگیوں کو قلم کی نوک سے تجربے اور احساس کا نمائندہ بنا کر جب شاعر شعر کی تخلیق کرتا ہے تو وہ

میرؔ کی زبان سے کچھ یوں سامنے آتا ہے۔

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں(۸)

حال تو حال زار ہے تاحال
دل وہی بے قرار ہے تاحال(۹)

میرؔ نے اپنی شاعری میں ٹھیٹھ بول چال کی زبان استعمال کی انہوں نے لفظوں کے ذریعے تہذیبی عکاسی کی اور زبان کو تہذیب و تمدن کا نمائیدہ بنادیا۔ کلامِ میرؔ اپنے عہد کی تہذیب کی پیکر تراشی ہے جہاں برصغیر کی تاریخ، تہذیب و سماجی عکاسی لفظوں کی صورت جلوہ نما ہوتی ہے۔ زبان کسی بھی تہذیب کو حسن دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی بھی۔ جب تہذیبوں کا خاتمہ ہوتا ہے تو ایسے میں انسانی ذہنی ارتقاء میں اپنا حصہ ڈالنے والے تخلیق کار، اس تہذیب کے نوحہ خواہ بن کر زندہ رہتے ہیں جیسا میرؔ کہتے ہیں:

گو لکھنؤ ویراں ہوا ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلقِ خدا ملکِ خدا(۱۰)

تخلیق کا خاص طور پر شاعر زبان کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اردو کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب سیاسی، سماجی، معاشرتی انتشار کا دور تھا تو اس وقت اردو زبان میں بڑی شاعری تخلیق ہوئی۔ میرؔ کے دور کو دیکھیں یا پھر غالبؔ کے وہ ایک انتشار اور بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہی اور بربادی کے ادوار تھے لیکن ان ادوار میں بڑے بڑے شعراء پیداء ہوئے جنہوں نے شاعری کے ذریعے زبان کو محفوظ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تہذیبی و ثقافتی قدروں کو بھی شاعری کے استعاروں میں سمولائے۔

میرؔ نے اپنے دور میں زبان کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ زبان کی ابیاری کی اور بچالائے۔ میرؔ نے ایسے لفظیات کا استعمال کیا، جس سے پوری تہذیبی بنت کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ میرؔ کے ہاں لفظ میاں کی تکرار ایسی ہے، جو بغیر کسی کاوش کے ہر دیوان میں موجود ہے۔ لفظ میاں ہماری مشرقی تہذیب کا ایک منفرد لفظ ہے جس میں لہجے کا فرق معنی پر اثر پذیر ہو کر محبت اور اجنبیت کے احساس کو جگاتا ہے۔

عشق وہ خانمہ خراب ہے میاں
جس سے دل آگ و چشم آب ہے میاں(۱۱)

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصورِ بے مثل
ہائے کیا صورتِ پردے میں بناتا ہے میاں(۱۲)

اسی طرح تشبیہ، استعارہ کی اوٹ میں بھی میرؔ مختلف تہذیبی عناصر کی پیش کش کرتے ہیں۔ میرؔ نے فارسی تراکیب اور الفاظ کا استعمال کم سے کم کیا اور یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ جسے میرؔ جیسا شاعر ملا، جس نے تخلیقی سطح پر نئے امکانات کو روشن کیا۔ اس حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ۔

"میرؔ کی زبان فارسی کے زیرِ اثر نہیں ہے بلکہ فارسی الفاظ و تراکیب، اردو کے مزاج میں ڈھل کر ایک نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میرؔ کی زبان فارسی کے اقتدار کو ختم کر کہ اردو کی حاکمیت قائم کر دیتی ہے۔"(۱۳)

یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب سے لگاؤ اور مٹی سے محبت میرؔ کو فارسی کے بجائے ہندوستانی کی طرف راغب کرتی ہے۔ میرؔ نے اپنے زمانے کی سماجی اور نفسیاتی عکاسی بھی اپنے اشعار میں بہت عمدگی سے کی ہے۔ ان کی شاعری میں کہانی پن کا عنصر پایا جاتا ہے، یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی داستان منظوم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ محمد شاہی دور ایک انتشار اور بے ترتیبی کا دور تھا جس میں ہر شخص کی خواہش تھی کہ کہیں سے سکون کی فضاء میسر ہو۔ میرؔ نے اس خواہش کو اپنے اشعار میں پیش کیا، اسی طرح مذہبی مجلسوں کا ذکر کیا اور دیگر محفلوں کا بھی، جس کے ذریعے مردم آزار فضاء سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میرؔ کی غزل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو افضل بنا کر بھیجا ہے، مگر انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔ انسان کی ماہیت اور ارتقاء کے بارے میں میرؔ کے خیالات کو مربوط کیا جائے تو یہ اعتراف سامنے آتا ہے کہ انسان اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اس طرح میرؔ نے فرد اور فرد سے وابستہ فضاء کو پیش کیا جس میں عشقِ حقیقی اور مجازی کے مختلف تصورات کو سمویا۔ میرؔ کی ذاتی محبت میں ناکامی نے اگرچہ انہیں جنوں میں مبتلا کیا، لیکن اس جنوں میں بھی وہ ذات اور کائنات کے حوالے سے باہوش نظر آتے ہیں۔

عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابرِ بہاری وادی سے اٹھ کر آبادی میں آیا ہے(۱۴)

میرؔ کے ہاں منطقی استدلال کی کمی ضرور ہے مگر مشاہدے کی وسعت اس کمی کو قابو کر لیتی ہے۔ مشاہدہ میرؔ کو حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ وہ مظاہر فطرت اور نظام قدرت دونوں کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہوتا ہے۔ انھیں دنیا

کا یہ کارخانہ عجائبات کا طلسم کدہ معلوم ہوتا ہے۔ صاحب ادراک ہونے کے لئے سعی پیہم کی ضرورت ہوتی ہے اور میرؔ مشاہدے اور سعی پیہم ادراک کے حصول کے لئے جاری رکھتے ہیں۔

زمانے میں میرے شور جنوں نے
قیامت کا سا ہنگامہ اٹھایا(۱۵)

میر تقی میرؔ کو احساسِ خودی بھی ہے، وہ اپنی قدر سے واقف ہے کہ اس کی سوچ اور باتیں خاص ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا(۱۶)

میرؔ کی شاعری میں یہ تصور سامنے آتا ہے کہ حقیقت تک رسائی کے لئے دل کی بات ماننا پڑتی ہے۔ عقل کے ذریعے عشق کی پُر خطر راہ کا سفر نہیں کر سکتے۔ عقل کی اپنی ایک حیثیت ہے جس سے میرؔ کو انکار نہیں مگر عشق میں مجذوبی ہی کام آتی ہے۔ فطرت کے مظاہرے کی تازگی قائم رہتی ہے جس کا بیان میرؔ کے ہاں ملتا ہے۔ مشاہدہ کے زور سے میرؔ حسنِ فطرت کو بھی پابند قلم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں وحدت الوجود، نفسِ انسانی، خدا اور شرفِ انسانی کے مضامین بکثرت موجود ہیں۔ عشق مجازی کی رنگارنگی ہو یا پھر عشق حقیقی کی گہرائی، میرؔ کے ہاں اپنی ایک خاص صورت لے کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری سے کچھ نمونے یہاں پیش ہیں:

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دلداریاں بہت
سو التفات کم ہے دل آزاریاں بہت(۱۷)

بہت رونے نے رسوا کر دیا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت(۱۸)

کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز
عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ(۱۹)

ادب چونکہ زندگی کے محرکات کی پیداوار ہے۔ ہر شاعر اپنے ماحول کے حالات و تجربات کا غماز ہوتا

ہے۔ اس کے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات اور اس کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے تجربات و حادثات اور اس سلسلے میں شاعر کے تاثرات ہی دراصل شاعری کا رخ متعین کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری بھی اسی عمل کی بدولت تشکیل پاتی ہے۔ میرؔ کی شاعری کے محرکات دراصل اس کے عہد کے سماجی، سیاسی، میرؔ کے ذاتی اور خاندانی حالات ہیں۔

میرؔ ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ پورا ملک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن حملے کرتے اور جان و مال کو نقصان پہنچاتے۔ پورا ملک اقتصادی بدحالی کا شکار تھا، روزگار و کاروبار بند تھے اور لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ اس ماحول میں حساس ذہنوں نے زندگی کی بے قدری اور فنا کے احساس کو محسوس کیا۔ میرؔ بھی ایسے ہی شاعر ہیں، جنھوں نے زندگی کے بے قدری کے احساس کو پیش کیا مگر امید کے دامن کو سختی سے تھامے رکھا۔ میرؔ کی شاعری اپنے دور کے احساس زوال اور انسانی غم و الم کی عکاس ہے۔ ان کی شاعری کو بغور مطالعہ اس کے عہد کا پورا کینوس منعکس کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید عبداللہ، نقد میر (مغربی پاکستان)، لاہور: اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳

۲۔ واصف علی واصف، مشمولہ: نقوش-میر تقی میرؔ نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۸

۳۔ ظل عباس عباسی (مرتب)، کلیاتِ میر (جلد اول)، دہلی: قومی قونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۴

۴۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۵۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۷۔ آل احمد سرور (پروفیسر)، میرؔ کی مطالعے کی اہمیت، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۹

۸۔ ظل عباس عباسی (مرتب)، کلیاتِ میر (جلد اول)، ص ۲۹۴

۹۔ ایضاً، ص ۴۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۰۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۲۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۲۵

۱۳۔ جمیل جالبی (ڈاکٹر)، محمد تقی میرؔ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴

۱۴۔ ظل عباس عباسی (مرتب)، کلیاتِ میر (جلد اول)، ص ۸۰۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۲۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۶۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۶۵